جدید اُردو شاعری میں تشکیک اور الحاد کا رُجحان ......ایک مطالعہ

صائمہ علی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، ایجوکیشن یونیورسٹی بنک روڈ کیمپس، لاہور

Abstract

The truth about the existence of Creator, Universe and Man has always been an intrigving question for religion, philosophy, science and poetry. The Poet is free in such debate compare to prose. In classical Urdu poetry such debate have been expressed symbolically. But the Political, social and economic situation of the 20th century has created a worldwide consciousness which finds its reflection in Urdu Poetry as well. Especially in the backgrop of the progressive movement these debates became directly the subject of poetry. This study explores the works of those poets in modern Urdu poetry, in whose works this subject is regarded as a trend.

تشکیک کا مطلب ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھنا ہے۔ بظاہر تشکیک ایک منفی رویہ نظر آتا ہے جس سے مراد غیر یقینی اور غیر مذہبی رویئے کے لیے جاتے ہیں لیکن تشکیک تحقیق کے لیے ایک اچھا قدم ہے جو لگے بندھے نظریات کو شک کی نگاہ سے دیکھ کر اس کے حشو و زائد کو الگ کرتا ہے۔ یہ رویہ ہمیں عام زندگی میں بھی ملتا ہے جب ہم دکان سے نئ چیز بھی خریدیں تو اچھی طرح اس کی جانچ کرتے ہیں کہ کہیں یہ ناقص یا ناخالص تو نہیں لیکن عقائد خصوصاً مذہبی فکر میں یہ رویہ ہمارے جامد معاشری میں معیوب بلکہ معتوب سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی ملائیت ایسے سوال اٹھانے والوں کو منکر، ملحد، مُرتد جیسے القابات دینے میں سرعت دکھاتی ہے۔ نثر کی نسبت نظم میں تخیل کی آزادی کی بدولت شاعر اس نوع کے سوالات اٹھاسکتا ہے۔ چنانچہ یہاں مشاہدہ حق کو بادہ و ساغر کے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے

اُردو شاعری میں مسلّمات کی نفی، مروجہ اقدار سے انحراف، شرعی رسوم سے بیزاری، شریعت کی جگہ طریقت اور روایت کی جگہ بغاوت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سماجی پابندیوں کے باوجود شاعری میں تشکیک اور الحاد کے مضامین علامتی انداز میں سامنے آئے۔ شیخ، زاہد، واعظ، مسجد، مُصلّی، خرقہ، جُبہ، عمامہ ظاہر پرستی کی علامات قرار پائیں۔ کبھی اسلام کے مقابلے میں بتوں کو پسند کیا گیا تو کبھی کعبے کو چھوڑ کر دیر آباد کرنے کی سُوجھی۔ کبھی اسلام کی رونق کے لیے کفر کو ضروری خیال کیا گیا اور کبھی ترک اسلام کا اعلان کیا گیا لیکن کلاسیکی شاعری میں یہ فکر علامتی، طنزیہ اور لطیف پیرائے میں بیان کی گئی۔ جس میں سماجی اعتقادات کو ٹھیس لگانے کا انداز نہیں تھا لیکن بیسیویں صدی میں ہندوستانی معاشرے کی معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی زبوں حالی اور مغربی تہذیب کے تسلط نے عوام کے ساتھ اہل قلم کی سوچ بھی تبدیل کی عقلیت کی عینک سے قدیم اعتقادات کا جائزہ لیا جانے لگا اور مذہب

اور خدا کے وجود پر سوال اٹھائے گئے، خصوصاً ترقی پسند تحریک نے ان مباحث کو رواج دیا جو مغربی اور لا دینی فکر کے زیر اثر تھے اگر چہ اقبال کی فکر خصوصاً ''شِکوہ'' کی صورت میں فریاد کا مہذب اور مؤدب انداز موجود تھا لیکن شعراء نے اپنی ذات، کائنات اور خدا کے متعلق تشکیک کے براہ راست اظہار کو رواج دیا۔ اس تحریر میں ان شاعروں کا مطالعہ کیا گیا ہے جن کے ہاں تشکیک اور الحاد ایک رُجحان کے طور پر آیا ہے۔

یگانہ (۱۸۸۴۔۱۹۵۶ء):

یگانہ ایک قدامت پسند مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی تشکیک کا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ مغربی اثرات سے متاثر نہیں، وہ ترقی پسند تحریک کے اہم مخالفوں میں سے تھے۔ چنانچہ ان کی تشکیک کو محض مغربی کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تشکیک کا منبع ان کی پیچیدہ شخصیت ہے جو بنے بنائے راستوں پر چلنے اور عقائد کو جوں کا توں ماننے کے خلاف تھی وہ عقائد اور حقائق کو روایت کے بجائے ذاتی حوالے سے سمجھنا چاہتے تھے۔ اس رویئے نے ان کی ذات میں تشکیک کو جنم دیا جسے ان کے زمانے کی مذہبی ظاہر داری اور لکھنو کی بیرون بین فکر نے مزید ہوا دی۔ اس تشکیک کی خاص بات یہ تھی کہ وہ تلاش حق کس بیرونی سہارے کے بغیر ذاتی حوالے سے حاصل کرنا چاہتے تھے، چاہے اس میں گمراہی اور ناکامی کیوں نہ مِلے اگر چہ وہ غالب شکن تھے لیکن غالب کی طرح اپنی ہستی سے ہی سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے جو بھلے ہی غفلت ہو مثلاً :

؎ بندگی کا ثبوت دوں کیونکر
اس سے بہتر ہے کیجیے انکار

☆

؎ ارے یہ کیا کہ چاہوں تو بھی حق سے پھر نہیں سکتا
خود اپنے ہاتھ گمراہی کی کوشش رائیگاں کیوں ہو

☆

؎ چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے
مل جائے گی رہ راست، گم راہ تو ہو

انہیں یہ ''گمراہی'' اس لیے عزیز تھی کہ اس میں نہ صرف ذاتی محنت شامل ہے مگر راہ راست ملنے کے امکاں بھی اس لیے وہ اس سے شرماتے نہیں بلکہ قیمتی جانتے ہیں۔ یگانہ کے ہاں تشکیک اور خصوصاً الحاد ان کے زمانے کی حد سے بڑھی ہوئی معاشرتی ظاہر داری، کھوکھلی اخلاقیات اور مذہبی جنوں کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی ہے جس نے انہیں اس مذہب سے بیزار کر دیا تھا جو محض رسوم کا مجموعہ تھا اور اس خدا کا منکر کر دیا تھا جو دُنیا والوں کا تراشا ہوا تھا، وہ کہتے ہیں:

؎ سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا

یگانہ اس خدا کی مخالفت کرتے ہیں جو زمانے نے بنایا ہے اور اس انسان پر ہنستے ہیں جو ایسے خدا کو مان رہا ہے۔ خدا کے اُن کے متعلق نظریات ان اشعار سے واضح ہوتے ہیں:

زمانہ خدا کو خدا جانتا ہے
یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے
اس میں دل اپنا بھلا جانتا ہے
کہ اک ناخدا کو خدا جانتا ہے
خدا ایسے بندے سے کیوں پھر نہ جائے
جو بیٹھا دُعا مانگنا جانتا ہے

یہ اشعار واضح کرتے ہیں کہ نہ صرف وہ خدا کے شخصی تصور کے مخالف ہیں بلکہ اس رویئے پر طنز کر رہے ہیں جو لوگ عمل کے بجائے محض دُعا پر یقین رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر فاخر حسین کے مطابق:

''کرید کرید کر دیکھا جائے تو یگانہ کے کلام میں مذہب سے انحراف کے باوجود مذہبی احساس ضرور کارفرما نظر آتا ہے یعنی یہ کہ مذہب سے بے زاری زیادہ ہے اور الحاد کم۔''[۱]

یگانہ جبر و قدر کے معاملے پر بھی واعظوں اور خطیبوں کی خطابت کو نہیں مانتے۔ اگر سب کچھ کاتب تقدیر کی منشا سے ہو رہا ہے تو پھر انسان گناہ ارادے سے نہیں تقدیر سے کرتا ہے، مثلاً:

؎ کیا ٹلے گی مشیت ازلی
اک تسلی سی ہے دُعا کیا ہے

اس مضمون کو زیادہ تخلیقی قوت اور ایمائی انداز میں بھی بیان کیا ہے جو غزل کی روایت میں بہت بامعنی لگتا ہے:

؎ مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

؎ ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمان آزادی بجا لانا نہیں آتا

یگانہ نے اس ضمن میں طنز اور شوخی سے بھی کام لیا ہے۔ وہ بالواسطہ طور پر خدا اور مذہبی متعلقات کو نشانہ بناتے ہیں جس سے خدا سے زیادہ مذہب کے ٹھیکے داروں کو پیغام دینا مقصود ہے، مثلاً:

؎ صدمے دیئے تو صبر کی دولت بھی دے گا وہ
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں

☆

ڈاکٹر نجیب جمال کے مطابق:

''جس طرح وہ غالب پرستوں سے لڑتے لڑتے خود ''غالب شکن'' بن گئے تھے بالکل اسی طرح خدا کے معاملے میں بھی وہ اس خدا کے منکر ہو گئے تھے جسے بندگان خدا نے اپنی اپنی سہولت کی خاطر تراش رکھا ہے۔''[۲]

اس کے ساتھ یگانہ خدا کے وجود پر اس لیے بھی سوالیہ نشان لگاتے ہیں کہ اُس کے ہوتے ہوئے دُنیا میں اتنا ظلم اور ناانصافی کیوں ہے۔ اُن کی فکر کا ایک پہلو خدا کی تجرید ہے جو دنیا میں کہیں اپنا کردار ادا نہیں کرتا۔ غالب خدا کی غیبت کی وجہ سے ہی اُسے ''یگانہ و یکتا'' قرار دیتے ہیں۔ لیکن یگانہ غالب کی طرح اپنی فکر کو ایسا موڑ دینے سے قاصر نظر آتے ہیں ان کا کہنا ہے:

ے شش جہت میں ہے ترے جلوہ بے فیض کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گناہگار نہیں

☆

ے آندھیاں رُکیں کیونکر، زلزلے تھمیں کیونکر
کارگاہ فطرت میں پاسبانی ربّ کیا

یگانہ کے ناموافق، مخالفانہ اور مخاصمانہ ماحول نے ان میں حد سے زیادہ انا اور احساس خودی پیدا کر دیا تھا جس کے تحت وہ خود کو نمایاں کرنے کے لیے ہر نوع کے اعتقادات کی مخالفت کرتے تھے۔ یاس سے یگانہ، لکھنوی، چنگیزی بننا بھی اپنی انا کی قوت کا اظہار تھا۔ انہوں نے ہر نوع کے اعتقادات کی مخالفت کی جن میں مروجہ شعری معیار، اقبال، غالب، مذہب، خدا سب کچھ شامل تھا۔ نذیر صدیقی نے یگانہ کی تشکیک کو ذہین اور حساس آدمی کی زندگی میں وراثتی عقیدے اور ذاتی عقیدے کے کش مکش قرار دیا ہے۔[۱۳] ڈاکٹر وزیر آغا نے یگانہ کی اس انانیت کو احساس کمتری کے تحت ''تحفظ ذات'' کا عمل قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق ''یگانہ کے ہاں ''خودی'' کا لفظ زیادہ تر ''انانیت'' کے مفہوم میں اُبھرا ہے اور اس کی نوعیت اقبال کے لفظ ''خودی'' سے بڑی حد تک مختلف ہے۔''[۱۴] اس رو میں وہ خود کو اتنا بلند کرتے ہیں کہ یہ صورتحال پیدا ہوتی ہے۔

ے میں پیمبر نہیں یگانہ سہی
اس سے کیا کسر شان میں آئی

یگانہ کی تشکیک اور الحاد میں انانیت کے شدید احساس کے باوصف اس رویئے کی ناکامی کا احساس بھی ملتا ہے مثلاً:

ے خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

☆

ے پڑے ہو کونسے گوشے میں تنہا
یگانہ کیوں خدائی ہو چکی بس

خدا اور مذہب کے تصور سے بیزاری کے باوجود یگانہ کے ہاں ''بندگی'' کے آثار بھی پائے جاتے ہیں جن کا منبع بھی مذہب ہی ہے کیونکہ انہوں نے مذہب کے علاوہ جن ذرائع پر بھروسہ کیا اس سے کشف ذات حاصل نہیں کر سکے۔ رباعی میں کہتے ہیں:

ہے اور بھی اک راہ مذہب کے سِوا
منطق کے سِوا، علم مذہب کے سِوا
باز آ گئے منزل سے کہاں کی منزل
مطلب نہیں کوئی ترکِ مطلب کے سِوا

یگانہ کی حضرت علیؑ سے بے پناہ عقیدت انہیں مقامِ بندگی کی طرف لوٹاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

علی کا بندہ ہو کر بندگی کی آبرو رکھ لی
یگانہ کے لیے کیا دُور تھا منصور ہو جانا

یگانہ نے حضرت علیؑ کے قول ''میں نے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا'' سے متاثر ہو کر کہا تھا:

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

یہاں یگانہ بندگی اور شُکر کے اعلیٰ خیالات کی عکاسی کر رہے ہیں کہ ارادں کی کامیابی خدا کے وجود سے غافل کر دیتی ہے۔ اس لیے بدنصیب وہ ہے جو خوش نصیب ہے۔ یگانہ کی الحادی فکر کے ساتھ ان کے ہاں واقعہ کربلا کا گہرا علامتی رنگ تضاد کی صورتحال پیدا کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا اور مذہب کی مخالفت کے باوجود وہ مذہبی فکر سے آزاد نہیں جو ان سے کہلواتی ہے:

ہے کوئی ایسا محبت کے گنہ گاروں میں
سجدۂ شُکر بجا لائے جو تلواروں میں

☆

موت آئی آنے دیجیے، پروا نہ کیجیے
منزل ہے ختم سجدۂ شکرانہ کیجیے

سب سے بڑھ کر وفات سے چند دن پہلے کچھ لوگوں کی موجودگی میں یگانہ کا کلمہ پڑھنا، مسلمان اور شیعہ ہونے کا اقرار کروانا[۵] اور یہ کہنا:

> ''خدا کا شکر ہے یہ دُنیا والے تو مجھے کافر، ملحد اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ تم لوگ گواہ ہو کہ میں کس کلمے اور مسلک پر ساری عُمر کاربند رہا۔''[۶]

ظاہر کرتا ہے کہ خرد کے پاس یگانہ کی تشکیک کا حل نہیں تھا جو بالآخر انہیں نظر میں مِلا۔

جوش (۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء):

یگانہ کے بعد جوش ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں تشکیک اور الحادی رجحان کے طور پر آئے ہیں۔ جوش ایک قدامت پسند مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت مشرقی ماحول میں ہوئی لیکن ان کی طبیعت میں تلوّن تھا، ان کے مزاج میں مختلف رجحان ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ جس کے تحت وہ شاعر شباب و انقلاب کہلائے۔ اُن کے شعری مجموعوں کے نام بھی بیشتر حروفِ عطف کے ساتھ اختلافی کیفیات کو یکجا کرتے ہیں مثلاً شعلہ و شبنم، جنون و حکمت، آیات و نغمات، عرش و فرش، سُنبل و

سلاسل، سموم و صبا وغیرہ۔ اسی طرح مشرقی تہذیب کے پروردہ و دلدادہ ہونے کے باوجود وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ ہوئے۔ چنانچہ ان کی تشکیک میں مغربی اثرات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دراصل اس کے ڈانڈے بھی ان کی شخصیت میں ملتے ہیں جو خودنمائی پر مائل تھی۔ جوش کے ہاں تشکیک اور الحاد میں اعلانیہ رنگ نمایاں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناکردہ گناہوں کی داد پانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ خدا اور مذہب سے متعلق مخالفانہ انداز شاعری کے ساتھ ان کی نثر میں بھی ملتا ہے۔ اس بارے میں جارحانہ رویہ بھی اپناتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ان کے ماحول کی حد سے بڑھی ہوئی مذہبی شدت پسندی ہے جو انہیں گھر خصوصاً والد کی طرف سے ملی جس کا اظہار انہوں نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں صراحت سے کیا ہے۔ شاعری میں بھی وہ شعوری طور پر مذہب اور خدا کے متعلق ایسا انداز اپناتے ہیں جس سے سماجی اقدار کے ڈھانچے کو ٹھیس لگتی ہے۔ اُن کا غیر محتاط اور بے باک رویہ قارئین کو چونکانے، سنسنی پھیلانے اور خود کو نمایاں کرنے کا محسوس ہوتا ہے۔ خدا کے وجود پر اپنی تشکیک کا اظہار رباعی میں یوں کرتے ہیں:

؎ جس وقت جھلکتی ہے مناظر کی جبیں
راسخ ہو جاتا ہے ذات باری کا یقین
کرتا ہوں جب انساں کی تباہی پہ نظر
دل پوچھنے لگتا ہے خدا ہے کہ نہیں

جوش کی شاعری میں خدا کے تصور کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''جوش خدا کے روایتی تصور کے خلاف ہیں کیونکہ ان کے نزدیک انسان نے خدا کو بھی اپنی تنگ دلی اور تنگ نظر ہستی کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔''[۲]

جوش نے خدا کے شخصی تصور کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

؎ چار دن جو شاد ہے اور چار دن ناشاد ہے
یہ خدا تو آدمی کے ذہن کی ایجاد ہے
سخت حیراں ہوں یہ کیسا وہم کا طوفان ہے
اے عزیزو یہ خدا کے بھیس میں انسان ہے

یگانہ کی طرح جوش کے تشکیک و الحاد کی نوعیت بھی پیچیدہ ہے۔ ایک طرف وہ خدا کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ اس کی بے پایاں رحمت کے بھی قائل ہیں، مثلاً یہ رباعی دیکھیں:

؎ یہ نار جہنم یہ سزا کچھ بھی نہیں
یہ دعوتِ حق روز جزا کچھ بھی نہیں
اللہ کو قہار بتانے والوں
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

☆

جہنم سرد ہے جنت کے در کھلوائے جاتے ہیں
گناہ گاران الفت پیش داور لائے جاتے ہیں

ڈاکٹر سلیم اختر ''جوش کا نفسیاتی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک جوش کے مُبینہ الحاد کا تعلق ہے تو ان کا الحاد اسلام، دین کی روح، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بغاوت کا اعلان نہ تھا بلکہ بعض اُمور میں تخلیقی سطح پر بغاوت کا اظہار تھا۔ اس لحاظ سے جوش کو نطشے کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے جس نے اپنے عہد میں مرّوجہ مسیحی اخلاقیات کو مسترد کرنے کی سعی کی تھی۔ اس کے الحاد میں چھپی دین داری کو اقبال جیسا فلاسفر ہی سمجھ سکا البتہ جوش کو سمجھنے کے لیے کوئی اقبال نہ تھا۔''۸

جوش نے اپنی ایک رباعی میں خدا کے متعلق اپنے تصورات کو واضح کیا ہے:

علت کا نہ معلول و قضا کا منکر
حاشا نہ خبر، نہ مبتدا کا منکر
یاروں نے تشخص کا تراشا ہے جو بُت
الحاد ہے صرف ایسے خدا کا مُنکر

یگانہ کی طرح جوش بھی مذہبی ظاہر داری سے بیزاری کے باوجود مذہب کے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے۔ واقعہ کربلا اور امام حسینؓ اُنہیں راہِ حق کا پتہ بتلاتے ہیں۔ جوش کے مراثی میں امام حسین کے ساتھ بنی نوع انسان سے محبت اور خدا سے جو تعلق مِلتا ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی جوش کے مرثیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہاں شدت جذبات نے مناجات کا رنگ پیدا کر دیا ہے جو جوش کے ''مُبینہ کفر'' پر خندہ زن ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوش نے شریعت سے ہٹ کر ابراہیم بن ادھم کی طریقت کو اپنایا ہے جو حقوق العباد کو حقوق اللہ کی کلید سمجھتا ہے:

گو قباحت ہے بڑی کافر یزداں ہونا
اس سے بدتر ہے مگر کافر انسان ہونا''۹

امام حسین سے محبت بڑھ کر انسان سے محبت میں پھیل جاتی ہے چنانچہ زبان سے کفر والحاد کا ذکر کرنے کے باوجود جوش مذہب اور خدا کے دائرے سے نہیں نکلتے اور اس کی رحمتوں کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ انتظار حسین اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''باغی اولاد اپنے ماں باپ سے کتنا بھاگ سکتی ہے۔ جوش صاحب مذہب سے بغاوت کرتے ہیں۔ مذہبی رسوم سے بھاگتے ہیں۔ مگر کتنی دور بھاگتے ہیں۔ ان کا خمیر تو انہیں رسوم وعقائد سے اُٹھا ہے۔ خدا سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں مگر امام حسین راستے میں آ جاتے ہیں۔ مرثیہ انہیں کھینچ کر پھر اسی دائرے میں لے جاتا ہے... آدمی مذہب سے انکار کر سکتا ہے لیکن اس کی جڑیں اپنی تہذیب میں ہیں تو وہ رہے گا دائرے کے اندر ہی، سو جوش کی باغیانہ شاعری کو ایسے دوٹوک انداز میں الحاد کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔''۱۰

جوش کے ہاں تشکیک اور الحادی فکر مذہبی، شدت پسندی کے ردعمل کے طور پر آئی ہے ورنہ وہ انسان اور خالق کے

متعلق بے حد مُثبت رویہ رکھتے ہیں۔

ن-م-راشد (۱۹۱۰ـ۱۹۷۵):

اُردو شاعری میں راشد وہ نام ہیں جنکے ہاں بغاوت ذہنی رویئے، رجحان اور بنیادی موضوع کے طور پر آئی ہے۔ راشد نے مغربی تعلیم حاصل کی۔ اُن کے دور کی نسل پر مغربی اثرات چھائے ہوئے تھے۔ پھر راشد کا مغربی شاعری کا وسیع مطالعہ تھا جس کے اثرات ان کی شاعری پر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مشرقی مرغوب صنف غزل کے بجائے نظم خصوصاً آزاد نظم کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا لہٰذا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی فکر سے ان کا براہ راست تعلق تھا۔ انہوں نے دوسری شادی بھی مغربی خاتون سے کی۔ آخری عمر میں برطانیہ میں مقیم رہے اور وہیں انتقال کیا۔ جس بات سے ان کی وفات کے بعد ان کے عقیدے کے متعلق شبہات کو جنم دیا وہ تدفین کے بجائے جلائے جانے کی وصیت تھی۔ اس پس منظر میں ان کے ہاں خدا اور مذہب کے متعلق تشکیکی رویہ بامعنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ان کی شاعری اور شخصیت کے تجزیئے کی ضرورت ہے۔ راشد نے ایسے دور میں تعلیم حاصل کی۔ جب مغربی فلسفیوں اور شاعروں کے زیر اثر خدا کے وجود پر سوال اُٹھائے جا رہے تھے۔ مغرب روح کے بجائے مادے کو اہمیت دیتا تھا۔ یہ صورتحال ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے کش مکش اور الجھن کا باعث تھی جسے ایمان روک رہا تھا اور کفر کھینچ رہا تھا۔ چنانچہ یہ کش مکش راشد کے ہاں بغاوت بن کر اُبھری ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

> ''راشد کی اس بغاوت میں اس فرد کی سرکشی دکھائی دیتی ہے جس نے مغربی تعلیم حاصل کر کے اور مغربی فکر سے آشنا ہو کر مشرقی روایات کا چولا اپنے کاندھوں سے اُتار پھینکا تھا اور روحانی مسائل سے سروکار رکھنے کے بجائے مادے کی ٹھوس دنیا کو اہمیت دینے اور گزرتے ہوئے لمحے کا رس نچوڑ لینے کی طرف مائل ہو گیا تھا۔''[۱۱]

راشد مغرب کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی بے حد مشرقی تھے۔ وہ مغرب کی برتری سے اس لیے خائف تھے کیونکہ یہ مشرق کا خون پی کر حاصل کی گئی تھی۔ خدا سے بھی اُنہیں اس لیے شکایت تھی کہ وہ مشرق پر مہربان نہیں۔

ـــ تجھ کو معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سرا پردہ نسیان میں ہے

(شاعر درماندہ)

اقبال نے بھی مغرب پر رحمتوں اور مشرق کی زبوں حالی پر خدا سے شکوہ کیا تھا لیکن ان کے ہاں ادب کے تقاضے مجروح نہیں ہوتے لیکن راشد کے ہاں یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ:

نہیں اس دریچے کے باہر تو جھانکو
خدا کا جنازہ لیے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحرِ بے نشان کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے

(پہلی کرن)

راشد موجودہ دور کی اخلاقی تہی دامنی پر نظر کرتے ہیں تو انہیں خدا کہیں نظر نہیں آتا۔ ''سبا ویراں'' میں جو ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی Wasteland سے متاثر ہے، میں انہوں نے موجودہ انسان کی روحانی بے سمتی لاحاصلی کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ خدا اور انسان کی بنیادی کش مکش کا حل دریافت نہیں کر پائے۔ یہی کش مکش ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر عالم خوند میری کے مطابق:

''راشد کے شاعرانہ شعور میں خدا کی موت کے واضح اعلان کے باوصف انسان اور خدا کا ربط کشیش گریز کا Ambivalent ہی ہے اور نطشے کے نامعلوم خدا Unknown God کی طرح ایک خدا جو دراصل سماجی مذہب کا خدا ہے، راشد کا مسلسل پیچھا کیے جا رہا ہے۔''[۱۲]

راشد نے نظم ''سفر نامہ'' میں خدا کے تصور کو تجسیم عطا کی ہے۔ اور اسے ناشتے کی میز پر شاعر کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ یہ انداز غیر سنجیدہ سہی لیکن یہ گفتگو بہت سنجیدہ موضوع پر ہے۔

ہمیں اور کتنے ہی کام تھے (تمہیں یاد ہے)
ابھی پاسپورٹ لیے نہ تھے
ابھی ریز گاری کا انتظار تھا
اُسے ضد کے ناشتے میں شریک ہوں
وہ تمام ناشتہ
اپنے آپ کی گفتگو میں لگا رہا
''مجھے زمین کے لیے خلیفہ کی جستجو
کوئی نیک خو
جو مرا ہی عکس ہُو ہو بُہو''
تو امیدواروں کے نام ہم نے لکھا دیئے
اور اپنا نام بھی ساتھ اُن کے بڑھا دیا

اس نظم کے متعلق محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

''(میں) یہ بھی مانتا ہُوں کہ جسے عرش پر دکھایا گیا وہ خدا تھا اور جسے ''نور کا ناشتہ'' کرنے کے بعد زمین کی طرف روانہ کیا گیا وہ خود شاعر تھا۔ آدمی کی نمائندگی کرنے والا شاعر... اگر راشد کو خدا سے بیر ہوتا تو وہ شاعر کی سرشت کو اُس کی خُو پر کیوں کر استوار کرنے یا رکھنے کی للک اپنے من میں پال سکتا تھا۔''[۱۳]

راشد کی خدا کے متعلق تشکیک ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور حساس شخص کی کش مکش ہے۔ وہ ہر قدیم چیز کو فرسودہ سمجھ کر رد کرتا ہے۔ راشد کی ذاتی زندگی نے اُن کی شاعری سے مل کر غلط فہمیوں کو جنم دیا اور انہیں لادین انسان سمجھا گیا۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری اس تاثر کے متعلق رقم طراز ہیں:

''راشد کو ملحد و زندیق یا بےعقیدہ (Non-believer) ثابت کرنا دشوار ہی نہیں محال ہے، یہ درست ہے کہ ان

کے کلام میں مذہبی تصورات وعقائد خصوصاً خدا کے بارے میں تند و تیز مصرعے موجود ہیں جن میں مارکس، اینگلز اور نطشے جیسے فلسفیوں کے افکار کی مذہب کے بارے میں پیدا کردہ تشکیک کا پرتو پایا جاتا ہے لیکن یہ تشکیک صرف راشد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہر عہد ہر علاقے اور ہر مذہب سے وابستہ اکثر پڑھے لکھے لوگ عمر کے ایک حصے بالعموم جوانی میں تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر راشد کا عہد ہی کچھ ایسا تھا۔ مذہب دشمن فلسفوں اور طبیعاتی سائنس کے مادی نظریوں کی ایک یلغار تھی جو اس دور کی نئی نسل کے ذہنوں کو متاثر کر رہی تھی۔ راشد بھی اس سے متاثر ہوئے۔'' [۱۴]

راشد ذاتی زندگی میں لا دین یا مذہب بیزار شخص نہیں تھے۔ خطوط میں اُن کے مذہبی اعتقادات کا اظہار ملتا ہے۔ [۱۵] ان کے ہاں خدا کے متعلق نامناسب لہجہ خدا کے عدل اور قدرت کے متعلق سوالات اٹھاتا ہے جس کے ہوتے دنیا میں امن، دولت، اور ترقی کی غیر مساوی تقسیم نظر آتی ہے۔ حسن عسکری راشد کے اس رویئے کے متعلق لکھتے ہیں:

''راشد چاہتا ہے کہ خیر مُطلق اتنا قوی ہو کہ کوئی غلطی کر ہی نہ سکے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ شر مطلق اپنی فسوں کاری میں آزاد ہے تو اسے غصہ آ جاتا ہے اور اپنے معبود کو طعنہ دینے لگتا ہے۔'' [۱۶]

احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء):

ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری تشکیک سے یقین کا سفر طے کرتی ہے۔ وہ خدا کے وجود پر سوال اٹھاتے ہیں۔ تدبیر کی قوت، تقدیر کی خاموشی، بدی کی جیت، نیکی کی ہار جیسے موضوعات پر وہ بلا جھجک بات کرتے ہیں۔ ان کی الحادی فکر کی اہم بات یہ ہے کہ انہیں خدا ہر جگہ یاد رہتا ہے۔ شکوے میں بھی اور شکر میں بھی، غم میں بھی اور خوشی میں بھی، دین میں بھی دُنیا میں بھی، مثلاً:

؎ مجھ سے کافر کو ترے عشق نے یوں تڑپایا
دل تجھے دیکھ کے دھڑکا تو خدا یاد آیا

قاسمی کے ہاں خدا کے شکوے کا سب سے بڑا سبب غربت اور امارت کا تفاوت ہے۔ اس ضمن میں وہ اللہ کے عدل پر بھی سوال اُٹھاتے ہیں:

؎ انسان کو کوئی جواب تو دے
یا ربّ ترے عدل کی دہائی

؎ تری رحمت تو مُسلّم ہے مگر یہ تو بتا
کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی

قاسمی نے جنت اور دوزخ کے تصور پر بھی قلم آزمائی کی ہے۔ وہ انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے جنت کے قیام کو بھی یاد کرتے ہیں۔ اس بارے میں کہتے ہیں:

؎ مرے خدا نے کیا تھا مجھے اسیر بہشت
مرے گنہ نے رہائی مجھے دلائی ہے

اور کبھی جنت کو اپنا استحقاق سمجھتے ہیں جس کا سبب زندگی کی سختیاں ہیں۔ بے باک انداز ملاحظہ ہو:

ے اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

اس کے ساتھ خدا کی ذات پر بے حد یقین انہیں دُنیا کے غموں سے بچاتا ہے حتیٰ کہ کفر سے بھی۔

ے اس انتظار میں تکمیل کفر ہو نہ سکی
مجھے تو تیرا ہی چہرہ سحر نما ہو گا

ے خدا کو دیکھ لینا چاہتا ہُوں
''شنیدہ کہ بود مانند دیدہ''

☆

ے مرا کوئی بھی نہیں کائنات بھر میں ندیم
اگر خدا بھی نہ ہوتا تو میں کدھر جاتا

قاسمی ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے تھے جس کے اکثر لکھنے والوں کے ہاں خدا اور مذہب کے متعلق تحفظات پائے جاتے ہیں۔ قاسمی کا انداز، ترقی پسندوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ اس نوع کے سوال ضرور اٹھاتے ہیں لیکن اس کا انداز تنقید برائے تفہیم کا ہے۔ ترقی پسند شاعروں کے تصور خدا کے متعلق لکھتے ہیں:

''انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انہیں خدا سے کیوں بیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو ایک ایسے کیمیائی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے... الحاد کی گرم بازاری ہمارے ہاں صحیح فکری شاعری کی کمی کا نتیجہ ہے۔''[۷]

اس حوالے سے وہ نہ صرف ترقی پسند بلکہ جدید شاعری میں منفرد مقام رکھتے ہیں کہ ان کی شاعری تشکیک سے یقین کر سفر طے کرتی ہے۔ وہ خدا کے وجود پر سوالیہ نشان بھی لگاتے ہیں لیکن ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

ے کفر کے انکار کی عظمت کا گو منکر نہیں
میں کسی قوت کے حسن ربط کا قائل بھی ہوں

قاسمی کے ہاں انسان اور انسانیت پر اعتماد کے ڈانڈے دراصل تصور خدا سے ہی ملے ہوئے ہیں:

اللہ مرے کفر سے تو صرفِ نظر کر
میں تیری جھلک دیکھتا ہوں نور بشر میں

نُور بشر میں خدا کی جھلک ہی قاسمی کو انسان پر اعتماد دلاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشت انسان پر
کسی بھی شہر میں جاؤں غریب شہر نہیں

یہ اعتماد اس حد تک بڑھتا ہے کہ پھر کفر کو جنم دیتا ہے:

؎ یزداں پہ جھپٹ پڑے گا انساں
انسان ہٹا جو درمیان سے

قاسمی کے ہاں تشکیک انسانی ذہن کے فطری تجسس کے گرد گھومتی ہے کہ خدا کی خدائی میں ظلم و انصافی کیوں ہے۔ اس کے علاوہ وہ خدا کے لیے نامناسب لہجہ اختیار نہیں کرتے۔ یہ احتجاج بھی خدا کی قربت سے کی وجہ سے ہے کیونکہ کائنات بھر میں وہ خدا کو اپنا سمجھتے ہیں اس لیے دکھوں کی شکایت بھی اُسی سے کرتے ہیں۔ اس لیے دوسرے شعراء کے مقابلے میں ان کے ہاں خدا کے متعلق تشکیک کے ساتھ اُس پر یقین کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔

مصطفیٰ زیدی (۱۹۳۰ء۔۱۹۷۰ء):

مصطفیٰ زیدی نے بہت مختصر لیکن فعال زندگی گزاری۔ فراق اور جوش جیسے شاعروں کی قربت، ترقی پسندی سے وابستگی اور علیحدگی بیوروکریسی کے نشیب و فراز، سیر و سیاحت، تیغ الہٰ آبادی سے مصطفیٰ زیدی کا سفر، سول سروس کے باوجود چھ شعری مجموعے، شہناز سے دوستی اور پُراسرار موت، ان کی سیمابی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی شاعری میں تشکیک اور الحاد حیران کن معلوم نہیں ہوتا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے متعلق رائے سے اُن کی تشکیک کا اندازہ ہوتا ہے۔

> ''میری ترقی پسندی کسی زمانے میں ایک جماعت کی ترقی پسندی تھی لیکن اب کئی جماعتوں کی ترقی پسندی ہے۔ کسی ایک مروجہ عقیدے سے مکمل وابستگی میری آزادی مسلک کے خلاف ہے۔''[۱۸]

چنانچہ مذہبی عقائد بھی ان کی ''آزادی مسلک'' کی زد میں آئے اور انھوں نے خدا اور مذہب کے متعلق استہزائی انداز اپنایا۔

؎ چلو افلاک کے زینوں پہ چڑھ کے عرش تک پہنچیں
کہ سید مصطفیٰ زیدی اسی منزل میں رہتے ہیں

؎ سنسان پڑی ہیں برسوں سے سب رشد و ہدایت کی راہیں
اس عہد میں ہم سب اپنے امام، اس عہد میں ہم سب اپنے نبی

؎ ان سے سیدھے منہ ملیے تو ان کے دماغ نہیں ملتے
سب کو دیکھ لیا ہے یارو داتا کیا اَن داتا کیا

☆

؎ تم بھی خدا سے سوز جنون کی دُعا کرو
ہم پر تو اس بزرگ کے احسان عام ہیں

؎ منعم کا تو خدا بھی امیں، بت بھی پاسباں
مفلس کے صرف تیغ علیہ السلام ہیں

لیکن ان کے سیمابی مزاج کے تحت یہ رجحان بھی مستقل ثابت نہیں ہوا۔ اس پر ترقی پسند تحریک کی فضا کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی شخصیت ایک شفاف شیشے کی طرح معلوم ہوتی ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ان محدود لوگوں میں سے ہیں جو اپنے تمام محسوسات کو تحریر کی صورت دیتے ہیں۔ ان کی ''روح کی حقیقت'' ان کے آنسوؤں کے ساتھ تحریروں

سے بھی پوچھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اپنی الحادی فکر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''روشنی کے پہلے ایڈیشن میں جونعری بازی کی چند نظمیں تھیں ان کی فضا رومانی تھی اور اُس زمانے کے الحاد کی بھی یہی کیفیت تھی کہ مذہبی جنوں کے ردعمل کے طور پر اختیار کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب جوش ملیح آبادی ایک طرف ''پڑھ کلمہ لا الہ الہ انسان'' اور دوسری طرف ''ہم رند بھی ہیں حلقہ ماتم میں اے حسین'' کہتے ہیں تو یہ تضاد میری سمجھ میں آتا ہے۔ مجھے اس سے الجھن پیدا نہیں ہوتی۔''۱۹

مصطفیٰ زیدی کی رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ الحاد مذہبی سخت گیری کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوا۔ تشکیک کے حامل دوسرے شعرا کی طرح اُن کے ہاں بھی اس خدا کی مخالفت ملتی ہے جو دنیا والوں نے تراش رکھا ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں:

صوفی کا خدا اور تھا شاعر کا خدا اور
تم ساتھ رہے ہو تو کرامات رہی ہے

ناقد و دیدہ ور و کُفر کا الزام نہ دو
میرے الحاد میں اک پرتو الہام بھی ہے

زیدی کے ہاں ایک تعلیم یافتہ باشعور انسان کی آگہی، معاشرے کی مادیت پسندی، بے سمتی، لاحاصلی اور رائیگانی کا احساس بھی ملتا ہے جو انسان میں منفی جذبات اور مریضانہ سوچ پیدا کرتا ہے۔ ان کی موت جن پراسرار حالات میں ہوئی جس میں خودکشی کے امکان کو یکسر رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس ذہنی کرب کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے:

''میرے ملک کے معاشرے میں اپنے جامد نظریئے کے علاوہ کسی اور نظریئے کو قبول کرنا تو کیا، برداشت کرنے تک کا ظرف نہیں، بالخصوص جب مُلک کا مذہبی نظریہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہو تو خودکشی یا فرار۔''۲۰

شاعری میں اس کیفیت کا اظہار یوں کیا ہے:

دماغ شل ہے دل ایک ایک آرزو کا مدفن بنا ہوا ہے
اک ایسا مندر جو کب سے چمگادڑوں کا مسکن بنا ہوا ہے
نشیب میں جیسے بارشوں کا کھڑا ہو بے کنار پانی
بغیر مقصد کی بحث، اخلاقیات کی بے اثر کہانی
سحر سے بے زار، رات سے بے نیاز، لمحات سے گریزاں
نہ فکر فردا نہ حال و ماضی سے صبح خنداں نہ شام گریاں
پکارتا ہے کوئی تو کہتا ہوں اس کو سُن کر بھی کیا کرو گے
ادھر گزر کر بھی کیا ملے گا ادھر نہ جا کر بھی کیا کرو گے

(کاروبار)

اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں تشکیک صرف خدا کے متعلق نہیں ذات اور کائنات کے متعلق بھی ہے۔ زیدی اثنا عشری عقیدے سے تعلق رکھتے تھے۔ یگانہ اور جوش کی طرح اُن کے ہاں تشکیک کے ساتھ واقعہ کربلا کا علامتی رنگ فکر

کے دو انتہائی سروں کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ہر دو شاعروں کے خلاف کربلا کے متعلق ان کا انداز صرف عقیدت کا نہیں وہ محض سید زادہ ہونے کے ناطے خود کو شعور کربلا کی وراثت کا حقدار نہیں سمجھتے۔ اُن کا نامکمل مرثیہ بھی انکی منفرد طبیعت کا ثبوت ہے۔

سلیم احمد (۱۹۲۷ء-۱۹۸۳ء):

سلیم احمد کی شاعری بغاوت سے عبارت ہے جو فکری سطح پر بھی ہے اور اسلوب میں بھی ان کے ہاں قدیم اور جدید تہذیبی تصادم کی نتیجے میں پیدا ہونے والی بے یقینی اور تشکیک کی فضا ملتی ہے۔ وہ یگانہ سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے ان کے ہاں کھردری حقیقت، بے رحم سچائی، تلخ لہجہ ملتا ہے۔ ایک طرف وہ مذہبی فکر بھی رکھتے ہیں جبکہ دوسری طرف خدا کے متعلق یہ انداز بھی ملتا ہے۔

ے　ہے میرا خدا خدائے قہار
اندر سے میں شعلہ غضب ہوں

ے　مدت سے خدا بھی نہیں آیا مرے دل میں
بچوں کی طرح بھول گیا راستہ گھر کا

خدا سے انہیں یہی شکایت ہے کہ وہ اہل زمین کے مسائل میں دلچسپی نہیں لیتا اور انہیں حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ یہ شکایت بھی کہ دُنیا میں ظلم وستم کے باوجود خدا ظالموں کا احتساب نہیں کرتا۔

ے　قضا لیتی ہے ہر شے کا حساب آہستہ آہستہ
اترتے ہیں زمینوں پر عذاب آہستہ آہستہ
سبب یا مصلحت کھلتی نہیں لیکن یہ حیرت ہے
جرائم تیز تر اور احتساب آہستہ آہستہ

ے　زمین والوں کی مشکلوں کو سمجھ سکیں گے نہ عرش والے
کہ آسماں سے زمیں کے اوپر نگاہ پڑتی ہے طائرانہ

سلیم احمد روایتی اور جامد سوچ کے خلاف ہیں جو ہر چیز کو مخصوص تناظر میں دیکھتی ہے اور ہر نئی بات کو بدعت سمجھتی ہے۔ اس قسم کے رویئے پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ے　لوگ گو کفر کہیں اپنا تو ایمان ہے یہ
ایک ہو جائیں اگر مل کے خدا ہیں ہم تو

احمد فراز (۱۹۳۱ء-۲۰۰۸ء):

احمد فراز عشقیہ شاعری کے حوالے سے طلسماتی شہرت کے حامل ہیں لیکن غمِ دل کے ساتھ غمِ دنیا بھی ان کے ہاں مقدار اور معیار کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ہے۔ اسی نسبت سے ان کے ہاں تشکیک اور الحاد کے موضوعات ملتے ہیں۔ جو ایک شعری موضوع کی حد تک معلوم ہوتے ہیں۔ مستقل رجحان کی حیثیت نہیں رکھتے۔ خدا کے

متعلق ان کے ہاں شکایت کے بجائے شوخی اور شگفتگی کا رنگ ملتا ہے۔

ے	کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری آج خدا نے میرے

ے	ہم ایسے سادہ دلوں کو وہ دوست ہو کہ خدا
سبھی نے وعدہ فردا پہ ٹال رکھا ہے

ے	فراز کس کے ستم کا گِلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

ے	اس کی رحمت کا کیا حساب کریں
اک ہمیں سے حساب کرتی نہیں

ے	پھر آج دانہ گندم کے سلسلے میں فراز
کسی خدا نے مری خلد بیچ ڈالی ہے

فراز جدید دور کے مادیت پسند معاشرے، اخلاقی زبوں حالی اور رُوحانی بنجر پن کی وجہ سے آسمان سے مایوس ہیں۔ ناامیدی کی حالت میں کہتے ہیں:

ے	اب زمین پر کوئی گوتم نہ محمدؐ نہ مسیح
آسمانوں سے نئے لوگ اُتارے جائیں
وہ جو موجود نہیں اس کی مدد چاہتے ہیں
وہ جو سنتا ہی نہیں اس کو پکارے جائیں

فراز کی شہرت عشقیہ شاعری کے حوالے سے ہے۔ انہوں نے زندگی کے بہت سے رویوں کو عشق کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ درج ذیل شعر اس کی اچھی مثال ہے:

ے	جب تلک دُور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں

اس مُطالعے میں فراز ایسے شاعر ہیں جو باقاعدہ ان خیالات کے لیے تشکیک اور الحاد کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں:

ے	اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا

ے	تشکیک و ملحدانہ رویئے کے باوجود
رومی سے والہانہ عقیدت کے رات دن

کلاسیکی شاعری میں اس موضوع پر بہت شعر کہے گئے ہیں۔ لیکن وہاں براہ راست فرد جرم عائد کرنے کے بجائے ابہام سے کام لیا جاتا ہے۔ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ روئے سخن کس کی طرف ہے مثلاً میرؔ کہتے ہیں

ے ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

احمد فراز کے ہاں مذہبی فکر اور خدا کا مُثبت تصور نہ ہونے کے باوجود امام حسینؑ اور کربلا سے والہانہ محبت کا اظہار ملتا ہے۔ امام حسینؑ پر مکمل نظموں اور سلام کے علاوہ ۵۲ اشعار پر مشتمل قصیدہ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ غزل میں امام حسین اور کربلا کا علامتی اظہار بہت شاعرانہ خلاقی کے ساتھ کیا ہے۔

ے ایک بندہ تھا کہ اوڑھے تھا خدائی ساری
اک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نکلا

شہزاد احمد (۱۹۳۲ء-۲۰۱۲ء):

شہزاد احمد کی شاعری روایت کے شعور کے ساتھ روایت کی توسیع کرتی ہے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ انہیں نفسیات، فلسفہ اور سائنس سے دلچسپی ہے۔ اوّل الذکر دو مضامین میں انہوں نے ایم۔اے بھی کیا۔ اِن علوم کے پس منظر میں ان کے ہاں تشکیک کی فضا غیر فطری معلوم نہیں ہوتی۔ شہزاد احمد کی تشکیک کا اہم پہلو خدا کا بندوں سے دُور ہونا ہے۔ وہ اس خدا کا انکار کرتے ہیں جو زمین والوں کے مسائل پر توجہ نہیں دیتا۔ مثلاً:

ے میں بلندی پہ اگر جاؤں تو کیسے جاؤں
آسمانوں سے زمینوں پہ خدا کیوں آئے

ے بندے کا اور خدا کا تعلق ہی مٹ چکا
پتھر ہوئی زبان مناجات کیسے ہو

اس براہ راست اور تلخ انداز کے ساتھ ان کے ہاں خدا کے وجود سے ایسا شکوہ بھی ملتا ہے جس میں بالواسطہ انداز میں طنز کیا گیا ہے۔

ے نہیں ضرور کہ وہ مجھ سے التفات کرے
ہر ایک کی تو خدا بھی دُعا نہیں سُنتا

☆

ے واسطہ رکھتے نہیں خاک نشینوں سے کوئی
اب پیمبر نہیں قوموں پہ خدا آتے ہیں

شہزاد احمد کے ہاں شکوے کے ساتھ خدا کے وجود کے متعلق فلسفیانہ سوالات بھی ملتے ہیں۔ خدا کی ذات کا شعور بھی انہیں خدا کی تفہیم میں رکاوٹ محسوس ہوتا ہے:

ے جس کو جانا ہی نہیں اس کو خدا کیوں مانیں
اور جسے جان چکے ہیں وہ خدا کیونکر ہو

شہزاد احمد کے ہاں تشکیک کے ساتھ خدا پر ایمان، یقین اور بھروسہ بھی نظر آتا ہے۔ موجودہ زمانے کی روش دیکھ کر وہ

مایوسی کا شکار ہوتے ہیں، مثلاً:

ے　اب کہاں وہ نجد کے صحرا میں آواز بلال
مسجدیں ویران شکستہ ہو گئے مینار بھی

اس صورتحال میں وہ سارے مسائل کے حل کے لیے خدا کی طرف ہی دیکھتے ہیں۔ درج ذیل اشعار اس کی عکاسی کرتے ہیں:

ے　اے خدا مجھ کو دکھا ابر کرم کی صورت
جس قدر پیاس ہو اتنا ہی مجھے پانی دے
جس کی خواہش ہو وہی چیز مجھے مل جائے
ان زمینوں کو نئی طرح کی ارزانی دے

ے　وہ کرم کرتا ہی رہتا ہے گنہ گاروں پر
حل بھی دیتا ہے اگر کوئی پریشانی دے

تشکیک کے حامل بیشتر شعراء کی طرح ان کے ہاں بھی خدا سے شکوے کے باوجود اس پر ایمان اور یقین ملتا ہے۔

اُردو شعراء کے ہاں تشکیک اور الحاد کے رجحان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر اس کا سبب دنیاوی ظلم، ناانصافی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم ہے۔ اس کے ساتھ جس خدا کے وجود پر شعرا سوال اٹھاتے ہیں وہ شخصی خدا کا تصور ہے جو مذہبی شدت پسندی کے زیر اثر لوگوں نے تراش رکھا ہے۔ تشکیک کے ساتھ متوازی طور پر خدا اور مذہب کے ساتھ ایک گونہ وابستگی حیران کن محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً جوش، احمد ندیم قاسمی اور شہزاد احمد کے ہاں الحادی فکر کے ساتھ خدا پر بھرپور یقین اور محبت ملتی ہے لیکن زیادہ تر شعرا کے ہاں جو مذہبی فکر موجزن ہے وہ واقعہ کربلا اور اہلِ بیت سے محبت ہے۔ ان میں یگانہ، جوش، مصطفیٰ زیدی، سلیم احمد اور احمد فراز نمایاں ہیں۔ ان میں جوش کے علاوہ باقی شعراء کے ہاں مذہبی فکر کا یہ واحد ذریعہ ہیں۔ اس کے علاوہ خدا یا مذہب کا مثبت تصور ان کے ہاں کم ہے۔ یہ انداز سب سے نمایاں صورت میں یگانہ کے ہاں مِلتا ہے۔ جن کی شخصیت بہت پیچیدہ ہے۔ جنہوں نے اپنا تخلص بھی خدا کی مناسبت سے ''یگانہ'' رکھا اور اپنے نام کے ساتھ ''خداوند معانی، خاصہ خاصان ادب''۔۲۱ اور ''جل جلالہ'' کے الفاظ ان کی ذہنی کش مکش کی عکاسی کرتے ہیں۔۲۲ خود کو خدا کے بجائے علی کا بندہ قرار دینا بھی خدا سے حریفانہ کش مکش کو ظاہر کرتا ہے۔ اس پس منظر میں ان کا وفات سے پہلے دوبارہ کلمہ پڑھنا بہت معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔

ان شعراء میں راشد واحد شاعر ہیں جن کے ہاں تشکیک کے متوازی خدا یا مذہب سے وابستگی کے آثار شعری سطح پر بہت کم ملتے ہیں۔ راشد ذاتی زندگی میں مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ اولاد کو جائیداد میں شرعی حصہ دینا، مزار پر جا کر قرآن خوانی کرنا، دینی بزرگ سے عقیدت رکھنا،۲۳ شیلا راشد کا انہیں ''مسلمان اور محض مسلمان'' ۲۴ قرار دینا اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن شعری سطح پر اس کا اظہار بہت کم ہوا ہے۔ اُن کے ہاں ''سبا ویراں، مرگ اسرافیل'' اور ''ابولہب کی شادی'' کے کردار اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان نظموں میں راشد کی فکر اسلامی تاریخ سے مختلف ہے۔ مجموعی طور جدید اُردو شاعری میں تشکیک

انسانی علم و آگہی کا نتیجہ اور الحاد دُنیا کے نظام پر عدم اعتماد کی صورت میں نظر آتا ہے۔ شاعر خدا کے شخصی تصور کی تردید کرتے ہیں۔ اس کی تہ میں انسان کا علم و عرفان اور خدا کی ذات کا گہرا شعور بھی پوشیدہ ہے۔ سید تقی عابدی اس رجحان کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> ''یہ عجیب اور دلچسپ اتفاق ہے کہ جدید الحاد پرستی یا مذہب سے بغاوت کی یہ رو جو آج دیکھنے میں آئی ہے، اخلاق دشمنی سے نہیں، اخلاق نوازی سے پیدا ہوئی ہے۔ عہد جدید کو اخلاقی قدروں کا پہلے کے معاشرے کی بہ نسبت زیادہ شعور ہے اور اس لیے وہ مذہب اور خدا کے اس تصور سے بغاوت کر بیٹھا جو قدیم مذاہب نے دیا تھا۔ یوں کہہ لیجیے جو قدیم مذاہب کے انجماد کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔'' ۲۵

بحیثیت مجموعی یہ اُردو شاعری کا ایک اہم موضوع ہے جو مستقل رجحان کے طور پر کم شعراء کے ہاں ملتا ہے۔

حواشی:

۱۔ فاخر حسین، ڈاکٹر، مضمون ''یگانہ بیگانہ'' مشمولہ فنون، لاہور جنوری ۱۹۶۴ء، ص: ۲۲۳

۲۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، یگانہ، تنقیدی و تحقیقی مطالعہ، اظہار سنز، لاہور ۲۰۱۳ء، ص: ۲۳۴

۳۔ نذیر صدیقی، ''تاثرات و تعصّبات''، مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ، ۱۹۶۲ء، ص: ۲۷

۴۔ اُردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۴۹

۵۔ راہی معصوم رضا، مضمون ''یاس یگانہ چنگیزی، مشمولہ رسالہ گگن، بمبئی، جولائی ۱۹۶۸ء، ص: ۶۵

۶۔ شعلہ دوارکا داس، مضمون ''تیس برس کا قصہ ہے'' مشمولہ، کراچی، تخلیقی ادب، ۱۹۸۰ء، ص: ۴۳۰

۷۔ محمد حسن، ڈاکٹر، مضمون ''فکر جوش'' مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، مرتبہ قمر رئیس، جوش انٹرنیشنل سیمینار، دلی کمیٹی، ۱۹۹۳ء، ص: ۲۱

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص: ۲۱

۹۔ ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر اُردو مرثیہ پاکستان میں، سید اینڈ سید، کراچی ۱۹۸۲ء، ص: ۱۲۱

۱۰۔ انتظار حسین ''مُلاقاتیں''، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۱ء، ص: ۳۴۸

۱۱۔ ''ن۔م۔راشد، بغاوت کی ایک مثال'' مشمولہ نظم جدید کی کروٹیں''، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۴ء، ص: ۴۹

۱۲۔ عالم خوندمیری، مضمون'' راشد، انسان اور خدا''، مشمولہ رسالہ حکمت ۳، ن۔م۔راشد نمبر، حیدر آباد، ۱۹۷۸ء، ص: ۱۵۸

۱۳۔ محمد حمید شاہد (راشد، میرا جی، فیض)، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص: ۴۹

۱۴۔ فخر الحق نوری، ڈاکٹر، مضمون ''ن۔م۔راشد، ماورا سے گماں کا ممکن تک'' مشمولہ ''جدید شعری روایت''، لاہور، بیکن بکس، ۲۰۱۲ء، ص: ۳۴۳

۱۵۔ خطوط بنام حسن لطیفی ''اپنی تحریروں کے آئینے میں''، رسالہ نقوش، دسمبر ۱۹۸۶ء، ص: ۲۷۷

۱۶۔ محمد حسن عسکری، جھلکیاں، ساقی، دلی، اپریل مئی ۱۹۴۴ء

۱۷- جلال و جمال، سنگ میل، لاہور،۲۰۱۲ء،ص: ۳۰

۱۸- کلیات مصطفیٰ زیدی،شہرآذر،لاہور،الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء،ص

۱۹- روشنی،کلیات مصطفیٰ زیدی، چراغ آفریدم،الحمد پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء،ص

۲۰- کلیات مصطفیٰ،کوہ ندا، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

۲۱- نجیب جمال، یگانہ، اظہار سنز، لاہور،۲۰۱۳ء،ص: ۱۳۲

۲۲- بحوالہ عبدالماجد دریا آبادی، اداریہ، ہفتہ وار ’’صدق جدید‘‘ لکھنو، ۲۷ مارچ ۱۹۵۳ء،ص: ۱

۲۳- فخر الحق نوری، ڈاکٹر ’’مطالعہ راشد‘‘ فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء

۲۴- حسین شاہد، مضمون ’’سجناں وی مر جانا‘‘ مشمولہ، فنون، لاہور، اگست ستمبر ۱۹۷۶ء،ص: ۶۰

۲۵- تقی عابدی، مضمون ’’خدا اور اخلاقیات‘‘ مشمولہ ’’فلسفیوں کا خدا‘‘، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء،ص: ۶۱۱